Tauseeq, Volume. 5, Issue. 2
ISSN (P) 2790-9271 (E) 2790-928X
DOI: https://doi.org/10.37605/tauseeq.v5i2.7

Received: 06-12-2024
Accepted: 24-12-2024
Published: 31-12-2024

اردو زبان کے پھیلاؤ میں مذہبی، سیاسی اور معاشی عوامل کا کردار

Role of religious, political and economic factors in the spread of Urdu language

ڈاکٹر فاطمہ جلال*

عامر بشیر

ڈاکٹر سونیا بشیر

Abstract:

The content explores Urdu's linguistic roots as an Indo-Aryan language connected to Hindi, Bengali, Malayalam, Tamil, Telugu, Marathi, and Persian. It positions Urdu uniquely, influenced by both Arabic and Persian, proudly declaring it the "crown jewel of languages" with a distinct identity. The article attributes Urdu's evolution to political, religious, and economic factors, tracing its historical context back to the Arab-Muslim conquest in Sindh. It delves into the complexity of Urdu's formation, suggesting unpredictable origins and emphasizing its emergence with conquerors and Sufis arriving from mountainous regions. The narrative spans historical periods, highlighting the transformative impact of the 300-year Arab rule during the Umayyad era in Sindh. The content discusses geographical barriers, cultural interactions between linguistic families, and the literary promotion of Urdu during the Ghaznavid dynasty. The article concludes by affirming Urdu's deep-rooted connections to the historical, cultural, and linguistic landscape of the Indian subcontinent.

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف ایجوکیشن لاہور، فیصل آباد کیمپس

ایم فل اردو

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، عبدالولی خان یونیورسٹی مردان

Additionally, it summarizes the contributions of prominent figures like Sheikh Abdul Qadus Gangohi, Shams-ul-Ashaaq Shah Miran, and other Sufis in fostering cultural exchange change and the emergence of Urdu.

Keywords: Urdu, Indo-Aryan, Arabic, Persian, Linguistic roots, Political, religious, and economic factors, Arab-Muslim conquest, Geographical barriers, Cultural exchange

"اردو زبان ہندی، بنگالی، ملیالم، تامل، تیلگو، مراٹھی اور فارسی زبانوں کے تعلق سے ایک ہند آریائی زبان ہے۔ جب کہ عربی کے حوالے سے اس کا تعلق سامی خاندان سے بھی ہے۔ اس طرح یہ دنیا کی معدودے چند زبانوں میں سے ہے جن کا تعلق زبانوں کے تین بڑے خاندانوں سے ہے۔ زبانوں کے اختلاط و اشتراک کا یہ امتیازی وصف اردو ہی کو حاصل ہے۔ اسی لیے گوپی چند نارنگ نے 'اردو کو زبانوں کی دنیا کا تاج محل' قرار دیا ہے جو نہ عربی و فارسی کی کاربن کاپی ہے نہ سنسکرت کی اور اپنے تہذیبی و جمالیاتی امتزاجی حسن و دل کشی اور تہہ داری کی بنا پر اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔"(۱)

دوسری زندہ اور بڑی زبانوں کی طرح اردو کی نشو و نما اور فروغ میں بھی انھی تین عوامل؛ سیاسی، مذہبی اور معاشی عامل کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

"فروغِ اردو کے سلسلے میں جہاں تک سیاسی عامل کا کردار ہے تو یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ ہندوستان ایک طرف سے خلیج بنگال دوسری طرف سے بحیرہ ہند جبکہ شمال کی جانب سے سے ہمالیہ، ہندوکش، قراقرم اور کوہ سلیمان کے دشوار گزار پہاڑی سلسلوں کے حصار میں واقع ہے۔ بحیرہ عرب کی طرف سے ہندوستان میں مسلمان فاتحین کی آمد کا سلسلہ اموی دورِ حکومت سے شروع ہوا جو عباسیوں کے دور تک قائم رہا۔ سندھ میں عربوں کی حکومت کا مجموعی عرصہ تقریباً ۳۰۰ سال ہے۔ یہ عرصہ دو قوموں کی لسانی اور ثقافتی ہیئت کی تبدیلی (Metamorphosis) کے لیے بہت کافی ہے اور اس سے سید سلیمان ندوی کے مقدمہ سندھ کو بھی تقویت ملتی ہے۔"(۲)

لیکن یہ دل چسپ حقیقت ہے کہ وہ زبان اردو ہے جس کا نام معرض وجود میں آنے کے لیے شمال مغرب کے پہاڑی دروں سے گزر کر غزنی، غور اور فرغانہ سے آنے والے فاتحین اور ان کے جلو میں آنے والے صوفیائے کرام کی منتظر تھی۔

زبانوں کی تشکیل ایک انتہائی پیچیدہ اور پر اسرار عمل ہے۔ یہ ایک ایسا کیمیائی عمل ہے کہ جس کا نتیجہ سامنے آنے تک ہم اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتے بل کہ نتیجہ آنے کے بعد بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون سے عناصر تھے جن کا امتزاج اس لفظ یا پیرائے پر منتج ہوا۔ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بس قیاس و گمان یا تجزیہ و تحلیل ہے۔ کسی بھی زبان کے بارے میں ہماری تمام تحقیق ان چار دوائر سے باہر نہیں جا سکتی۔ اردو کی تشکیل کا معاملہ بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ گیارھویں صدی کی ابتدا میں محمود غزنوی کی ہندوستان میں آمد سے جن فتوحات کا در ہوا وہی فتوحات معاشرتی ربط و ارتباط اور تہذیبی و ثقافتی لین دین کے نتیجے میں ایک نئی زبان کے وجود میں آنے کا سبب بنیں۔

> "محمود غزنوی کے دور حکومت میں اصفہان و ہمدان، سمرقند و بخارا اور غزنی و کابل سے لے کر پشاور اور لاہور تک تمام علاقہ غزنوی سلطنت کا حصہ تھا۔ دورِ زوال میں بھی جب لاہور غزنویوں کا پایہء تخت تھا تب بھی ان کی حکومت شمال میں لاہور سے پشاور تک اور مشرق میں دہلی تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ حکومت کوئی دو سو سال تک قائم رہی۔ اس دوران میں علوم و فنون کی سرپرستی اور شعر و ادب کی قدردانی ان کا شعار رہی۔ اسی دور میں ایک نئی زبان کے خدوخال ابھرنا شروع ہوئے جو ابتدا میں لاہوری اور بعد میں اردو کہلائی۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر مسعود سعد سلمان کے اس علاقے اور اس عہد سے تعلق کی بنا پر پنجاب کو اردو کا مرزبوم بھی کہا جاتا ہے۔"(۳)
>
> "اگرچہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خان، محمود شیرانی کے نظریے سے متفق نہیں۔"(۴)

تاہم پنجاب سے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کا جنم لینا اور موجودہ اردو میں پنجابی کے بے شمار الفاظ کا پایا جانا نہ صرف اردو کی قدامت اور پنجاب سے اردو کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے بل کہ اردو زبان کی نشوونما میں سیاسی عامل کی اہمیت کو بھی سامنے لاتا ہے۔

ہندوستان میں غزنوی خاندان کی حکومت ہو یا غوریوں کی، خاندان غلاماں (قطب الدین ایبک، ایلتتمش، غیاث الدین بلبن، جلال الدین خلجی، علاؤالدین خلجی) کا عہد ہو یا خاندان تغلق کا، اس 200 سال پر محیط عرصے (1206ء تا 1413ء) میں لاہور سے بنگال تک، خیبر سے سندھ تک، کوہ ہمالیہ سے کوہ بندھیاچل تک اور شمال سے جنوب تک مسلمانوں کی مضبوط حکومتیں قائم رہیں۔ کچھ حکمرانوں کے ادوار کو چھوڑ کر اس تمام عرصے میں علوم وفنون اور شعر وادب کی ترویج اور سرپرستی کا عمل جاری رہا۔

کسی بھی زبان کی تشکیل کی عموماً دو سطحیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک عوام کی سطح دوسری خواص کی سطح۔ بلاشبہ حکمرانوں کے نزدیک ادب کی سرپرستی کا مقصد کسی نئی زبان کی تشکیل نہیں تھا لیکن "الناس علی دین ملوکھم" کے مصداق یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اپنے حکمرانوں کے اتباع میں، شعرا اپنی تخلیقات میں اور عوام بول چال میں ان کی زبانوں عربی، فارسی اور ترکی کا استعمال نہ کریں لہٰذا ایک trickle down effect کے نتیجے میں اشرافیہ کی زبان عوام الناس کی زبان بن گئی۔

ادب، کسی قوم یا علاقے کی، ایسی غیر دستاویزی تاریخ (Un documented History) کا نام ہے جس میں کسی علاقے یا سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیاں ہی نہیں اس میں رہنے والے افراد کی خواہشوں اور محرومیوں بل کہ خوابوں کا عکس بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت امیر خسرو اور اس دور کے ایک اور اہم شاعر بو علی قلندر کے کلام میں ہمیں وہ سب کچھ تو نظر آتا ہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کے علاوہ ان شعرا اور بزرگان دین کا کلام اردو زبان کے ابتدائی اور ارتقائی مراحل کا دستاویزی ثبوت (Documented Proof) بھی ہے۔ گویا ادب کسی قوم کی غیر دستاویزی تاریخ مگر اس کی زبان کا دستاویزی ثبوت ہوا کرتا ہے۔

سنت نام دیو، بھگت کبیر اور بابا گرونانک بھی ان تین مسلمان صوفیوں کی لڑی کا ایک اہم حصہ تھے۔ ان سب کا زمانہ کچھ تقدیم و تاخیر کے ساتھ تیرھویں سے پندرھویں صدی تک کا زمانہ ہے۔ بابا فرید ہوں یا بو علی شاہ قلندر؛ امیر خسرو ہو یا سنت نام دیو؛ بھگت کبیر ہوں یا حضرت بابا گرونانک؛ ان سب کے کلام میں ایک نئی زبان کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ امیر خسرو اور بو علی شاہ قلندر کے کلام میں فارسی، بابا فرید اور گرونانک کے کلام میں پنجابی؛ سنت نام دیو اور بھگت کبیر کے کلام میں ہندی عنصر نمایاں ہے لیکن آپ ان کی شاعری کا لسانی تجزیہ کر کے دیکھ لیں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ امیر خسرو کا کلام صرف فارسی، بابا فرید کا کلام صرف پنجابی اور بھگت کبیر کا کلام صرف ہندی شاعری کا نمونہ

ہے۔ یہ سب اپنے اپنے زمان و مکاں اور اپنے اپنے ذوق و طبع کے مطابق شعر تخلیق کر رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک زبان و بیان کے نئے آفاق تسخیر کر کے برصغیر کی علمی اور تہذیبی تاریخ کا ایک نیا باب ایزاد کر رہا ہے۔

جس طرح ہندوستان کے مقامی شاعر اپنے کلام میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ و محاورات کو شامل کر کے ایک نئی زبان خلق کر رہے تھے اسی طرح ایران اور ہند کے فارسی گو شعرا اپنے کلام میں مقامی زبانوں کے خوب صورت اور سبک الفاظ شامل کرنے میں غیر شعوری طور پر مصروف تھے۔ اس کاوش کے نتیجے میں فارسی شاعری کا جو نیا version سامنے آیا اسے 'سبک ہندی' کا نام دیا گیا۔ گوپی چند نارنگ اس سارے عمل کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں۔ وہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو عربی، فارسی اور ترکی تہذیب کی ماتحت یا ان تہذیبوں کی کوئی ذیلی ثقافت نہیں سمجھتے۔ وہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو اس کی زبانوں سمیت ایک بڑی تہذیب مانتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> "فارسی کے ہندوستانی شعرا پر تو ہندوستان کا رنگ چڑھنا ہی تھا سمرقند و بخارا اور خراسان کے فارسی شاعروں کے لیے بھی ہندوستان جنت آرزو ہو گیا۔" (۵)

اپنے اس بیان کی دلیل میں انھوں نے صائب، ابو طالب کلیم، علی قلی سلیم، قوصری، شکیبی اصفہانی، ظہوری، عبد القادر بیدل اور شیخ علی حزیں کے متعدد اشعار کا حوالہ دے کر فارسی شاعروں کے دلوں میں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کے لیے پائی جانے والی کشش کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایران کے فارسی گو شعرا میں امیر خسرو کا ذکر بطور خاص کرتے ہیں جن کا زمانہ ان شاعروں سے تین سو برس پہلے کا ہے جنھیں بہ قول گوپی چند نارنگ:

> "ہندوستان کی مٹی سے ایسا انس ہو گیا تھا کہ جگہ جگہ اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ مثنوی نہ سپہر اور ترانوں میں انھوں نے متعدد اشعار میں ہندوستان کی خوبیاں بیان کی ہیں اور اسے اپنے آباؤ اجداد کے وطن بلخ و بخارا اور ماوراء النہر پر ترجیح دی ہے۔" (۶)

:ان دلائل سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

> "جب فارسی کا، جو کہ غیر ملکی زبان تھی، یہ عالم ہے تو اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو ،جو مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے تاریخی تقاضوں سے وجود میں آئی، اور جس کا ڈھانچہ شمالی

ہندوستان ہی کی بولیوں پر رکھا گیا تھا، کس حد تک ہندوستانی ذہن کی آئینہ دار ہو گی۔"(۷)

شمالی ہند کی نسبت جنوبی ہند میں اردو کا فروغ بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا مرہون منت ہے۔ جنوبی ہند کے ان ادب دوست حکم رانوں نے اس نئی زبان میں تخلیقات پیش کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کو گراں قدر انعامات سے نوازا۔ یہ صرف ان بادشاہوں کی ادب نوازی اور ادب دوستی ہی تھی جس نے جنوبی ہند میں اردو کی نشو و نما میں اضافے اور سمت و رفتار کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جنوبی ہند کی مختلف سلطنتوں کے یہ حکم ران نہ صرف اردو کے سرپرست اور مربی تھے بل کہ خود بھی اس زبان میں شاعری کیا کرتے تھے۔

قطب شاہی سلطنت کا ایک اہم حکم ران محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اگرچہ زمانی اعتبار سے مسعود سعد سلمان کو اولیت حاصل ہے لیکن اس کا دیوان دست بردِ زمانہ کی نذر ہو جانے کی بنا پر صرف تاریخ ادب کی کتابوں میں یک سطری تذکرے کے طور پر زندہ ہے جب کہ محمد قلی قطب شاہ کے دیوان کے قلمی اور مطبوعہ نسخے برصغیر کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ اور جنوبی ہند کی ریاستوں کے دوسرے حکم رانوں کی ادب پروری اور شاعری سے ان کا شغف ایک مثالی حیثیت رکھتا تھا جس کے نتیجے میں جنوبی ہند شعر و ادب اور فنون لطیفہ کا گہوارہ بن گیا۔ دور دراز سے صاحبان علم اور اہل فن کھچے کھچے ان سلطنتوں کا رخ کرنے لگے۔ اہل فن کے گراں قدر وظائف مقرر تھے جو انھیں گھر بیٹھے ملا کرتے تھے۔ اہل علم و فن بھی حق نمک ادا کرنے کے لیے راگ، راگنیاں تخلیق کرتے، مثنویاں لکھتے، رسائل تصنیف کرتے اور انعام و اکرام پاتے۔ حکم ران دور دراز سے اہل فن اور اہل علم کو اپنے درباروں میں مدعو کرتے اور ان کی قدر افزائی کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بہمنی حکمران نے شیخ سعدی کے علم اور تجربے سے استفادے کے لیے قیمتی ہدایہ اور تحائف بھیج کر انھیں اپنے دربار میں طلب کیا۔ وہ بھی آنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن بوجوہ ہندوستان نہ آسکے۔ بہمنی، عادل شاہی، نظام شاہی اور قطب شاہی سلاطین کے علاوہ گجرات، مالوہ اور جونپور کے حکم ران بھی علم و ادب کی قدر افزائی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ صاحبان علم و کمال کی قدر دانی کی وجہ سے یہاں علم و ہنر اور شعر و ادب کی اس قدر کتابیں تصنیف ہوئیں کہ صرف ان کی توضیحی فہرستوں پر مبنی کئی کتابیں تالیف ہو چکی ہیں۔ اس خطے سے معرض ظہور میں آنے والے شعرا، ادبا، علما اور دیگر علوم و فنون کے ماہرین کے ناموں کی طویل فہرست، یہاں کے فرماں رواؤں کے شعر و ادب اور علم و ہنر سے گہرے شغف کی مظہر ہے۔

بعد میں برصغیر کی زَمامِ اقتدار لودھی خاندان سے ہوتی ہوئی مغل حکم رانوں کے ہاتھ آئی۔ بابر اور ہمایوں کے بعد شیر شاہ سوری کا چار سالہ دور بھی برصغیر کی تاریخ کا ایک سنہرا دور ہے۔ شیر شاہ سوری نے دوسرے مغل حکم ران ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان کا تخت مغلوں سے چھین لیا لیکن اس کے موت سے شکست کھانے کے بعد ہمایوں دوبارہ سریر آرائے سلطنت ہوا لیکن خود بھی جلد ہی موت سے شکست کھا کر راہی ملک عدم ہوا۔ ہمایوں کے بعد اس کے بیٹے جلال الدین اکبر کے عہد میں مغلوں کو دوبارہ استحکام نصیب ہوا اور برصغیر میں وہ عظیم الشان تیموری سلطنت قائم ہوئی جو خلیج بنگال کے ساحلوں سے لے کر سندھ میں بحیرہ عرب تک اور شمال میں کوہ ہمالیہ سے لے کر جنوب میں کیرالہ کے پانیوں تک تقریباً تین سو سال (1556ء سے 1857ء) قایم رہی۔ یوں تو اکبر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کسی بھی مغل حکم ران نے ادبیات فارسی و اردو اور دیگر علوم و فنون کی سرپرستی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن یہ شاہجہان تھا جس کے دور میں اردو زبان جو برصغیر کے مختلف علاقوں میں لاہوری، ملتانی، دکھنی، ریختہ، ہندوی، ہندوستانی، کھڑی بولی اور دہلوی جیسے ناموں سے موسوم تھی قلعہء معلی کی نسبت سے 'اردوئے معلی' کہلائی اور دہلی اس زبان کی ٹکسال قرار پائی۔

دہلی کو برصغیر کا پایہ تخت ہونے کی بنا پر جو مرکزیت حاصل تھی وہی مرکزیت یہاں پروان چڑھنے والی زبان اردوئے معلیٰ کو حاصل ہو گئی۔ اس طرح لاہوری، دکنی، مراٹھی اور اردو کو جنم دینے والی دوسری زبانیں پس منظر میں چلی گئیں اور اردو کا سورج پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔

اگر فاتح ملک فتح کرتے ہیں تو صوفیا کو دلوں کا فاتح کہنا غلط نہ ہو گا۔ دلوں کو فتح کرنا ملکوں کو فتح کرنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے کیوں کہ تلوار سے ملک تو فتح کیے جاسکتے ہیں لیکن دل نہیں۔ مصر و شام ہوں یا افریقہ؛ ایران و خراسان ہوں یا ہند اور سندھ مسلمان علما اور صلحا ہر جگہ، کہیں مبلغین اور کہیں صوفیا کی صورت میں کبھی فاتحین سے پہلے اور کبھی بعد میں پہنچتے رہے ہیں۔ زمانہ شاہد ہے کہ مبلغین اور صوفیا کی فتوحات کا دایرہ گہرائی اور گیرائی ہر دو اعتبار سے بادشاہوں اور فاتحین سے زیادہ وسیع رہا ہے۔

برصغیر میں بھی مسلمانوں کی تہذیب کو دوام بخشنے میں علمائے حق اور صوفیاے کرام کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ یہ علمائے حق اور صوفیائے کرام اپنے اپنے وقت میں معاشرے کی مرکزی و محوری طاقت رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو ان کی طاقت اتنی بڑھ جاتی تھی کہ بادشاہوں کو بھی اپنی حکومت یا سلطنت کے استقرار کے لیے ان سے مدد لینی پڑتی تھی۔

صوفیائے کرام کی خانقاہیں وہ بار گاہیں تھیں جن کے دروازے ہر عام و خاص اور شاہ و گدا سب کے لیے دن رات کھلے رہتے تھے۔ اپنے اثر و رسوخ کے اعتبار سے یہ بادشاہوں کے درباروں سے کسی طرح کم نہیں تھیں۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق نے شیخ شرف الدین بو علی قلندر کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> "حضرت شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی بڑے صاحب جلال اور صاحب اثر بزرگ ہوئے ہیں۔ جب علاؤالدین خلجی اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کر کے تخت و تاج پر قابض ہوا تو اس نے اپنی سفاکی پر پردہ ڈالنے کے لئے لشکریوں نیز دوسروں کو اپنی داد و دہش سے خوش کرنے کی کوشش کی اس وقت اس کے مصاحبوں نے کہا کہ حضرت بو علی قلندر کو خوش کرنا بہت ضروری ہے اگر ان کی نظر آپ کی طرف سے پھری رہی تو رعایا میں ہر دل عزیزی حاصل کرنا دشوار ہو گا۔"(۸)

صوفیائے کرام کی برصغیر میں آمد کا سلسلہ یوں تو حضرت علی بن عثمان ہجویری (داتا گنج بخش) رحمۃ اللہ علیہ سے شروع ہو چکا تھا جو ۱۰۶۹ء میں ہندوستان تشریف لائے لیکن حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج (بابا فرید) رحمۃ اللہ علیہ وہ پہلے صوفی شاعر ہیں جن کے کلام میں ہمیں ایک نئی زبان کے آثار صاف دکھائی دیتے ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبد الحق نے ان کے کلام کے کچھ نمونے اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ اس کلام کا بنیادی ڈھانچہ وہی ہے جو اردو تحریر کا ہونا چاہیے سوا اس کے کہ بعض مصرعے پورے کے پورے فارسی میں ہیں اور بعض حصوں میں فارسی کا پیوند لگایا گیا ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبد الحق نے 'سرور الصدور' میں مذکور حضرت شیخ حمید الدین ناگوری کی ایک روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> "اس زمانے میں ان بزرگوں کے گھروں میں بھی ہندی بول چال کا رواج تھا اور کیوں کہ یہ ان کے مفید مطلب تھا اس لیے وہ اپنی تعلیم و تلقین میں بھی اسی سے کام لیتے ہیں۔"(۹)

حضرت شیخ نظام الدین کا شمار ہندوستان کے ان باکمال اور وسیع المشرب صوفیا میں ہوتا ہے جن کا فیض ہر مسلک و ملت اور ہر طبقہ انسانی پر عام تھا۔ اُنھیں صوفیا میں وہی مقام حاصل تھا جو بادشاہوں میں شہنشاہ اکبر کو حاصل تھا۔ اسی لیے انھیں 'سلطان الاولیا' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ سلطان الاولیا تھے آپ نے مختلف علوم بالخصوص شعر و ادب، سماع اور موسیقی کی سرپرستی بھی سلطانوں کی طرح

فرمائی۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیا کی سرپرستی کے نتیجے میں امیر خسرو جیسے صاحب کمال اور Visionary بزرگ کو اپنے ہنر کا جادو جگانے اور فن موسیقی میں نئی نئی جدتیں متعارف کروانے کا موقع ملا۔ امیر خسرو ہندوستان کی وہ نابغہ روزگار شخصیت ہیں جو شاعری میں استاد کامل اور موسیقی میں جگت گرو کا درجہ رکھتے ہیں۔ حضرت سلطان الاولیا شیخ نظام الدین، حضرت امیر خسرو سے ان کے تخلیق کیے ہوئے گیت اور راگ سماعت فرماتے اور اپنے قیمتی تبصروں سے نوازتے۔ اگرچہ فارسی اور ہندی موسیقی کے مختلف عناصر کو باہم آمیز کرنا امیر خسرو کی بہت بڑی جدت تھی جس کا ایک زمانہ معترف ہے لیکن فن موسیقی میں امیر خسرو کی اختراعات، فارسی اور ہندی راگوں کی آمیزش تک محدود نہیں تھیں۔ انھوں نے طبلے کے علاوہ ستار کی ساخت میں بھی کلیدی تبدیلیاں کیں مثلاً ستار پر تیسرے تار کا اضافہ، امیر خسرو کی وہ اختراع ہے جس نے اس آلہء موسیقی کو نہ صرف ہندوستانی موسیقی کی شناخت بنا دیا بل کہ آگے چل کر اسے ایسی عالم گیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ یہ The Beatles اور The Rolling Stones جیسے، یورپ میں موسیقی کے مقبول ترین طائفوں، کے آرکسٹرا کا اہم جز بن گیا۔ قدیم اردو تذکروں میں موجود دوہوں اور گیتوں کی شکل میں ان کا کلام ان کی وسیع النظری اور وسیع المشربی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ہندوستان کے ایک اور بہت بڑے صوفی، عالم اور دکنی زبان کے شاعر حضرت سید محمد ابن یوسف الحسنی الدہلوی بھی برصغیر کے ان نامور بزرگوں میں سے ہیں جن کے اردو زبان پر بہت احسانات ہیں۔

> "حضرت سید محمد ابن یوسف الحسنی عوام میں حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ دہلی میں سلطان الاولیا حضرت خواجہ نظام الدین کے جانشین شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اپنے مرشد شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے وصال کے بعد دکن چلے گئے تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے حضرت گیسو دراز کی متعدد تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک رسالہ "معراج العاشقین" خود بابائے اردو مولوی عبدالحق کا مرتبہ ہے۔ بابائے اردو کے مطابق اس کا سنہ کتابت 906 ہجری ہے۔"(۱۰)

بابائے اردو کے مطابق ان کے پاس رسالہ "معراج العاشقین" کے علاوہ دکنی / ہندوی زبان میں تصنیف کردہ حضرت گیسو دراز کے متعدد رسائل موجود ہیں۔ ان رسائل میں اگرچہ وہی قدیم زبان استعمال کی گئی ہے لیکن بابائے اردو ان رسائل کو اپنے کڑے تنقیدی معیار پر

پرکھنے کے بعد اس بارے میں متشکک ہیں کہ یہ تصانیف حضرت گیسو دراز ہی کی ہیں یا محض ان کے نام سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ تصوف کے موضوع پر لکھے ہوئے یہ رسائل حضرت گیسو دراز کے ہیں یا نہیں لیکن ان کی زبان کی قدامت سے اردو کی نشو و نما اور موضوعات سے وعظ و تبلیغ کے لیے اردو کے استعمال کے بارے میں بہت سے اہم اشارے ضرور ملتے ہیں۔

"شیخ عبد القدوس گنگوہی بھی اپنے وقت کے بہت بڑے صوفی، متعدد کتابوں کے مصنف اور ہندی کے شاعر تھے۔ شاعری میں ان کا تخلص 'الکھ داس' تھا۔"(۱۱)

الکھ کے معنی ہندی میں 'بے پتا" بے نشاں' اور 'نظر نہ آنے والا' کے ہیں۔ چوں کہ یہ تمام اوصاف اللہ تعالی کے ہیں اس لیے اس لفظ سے اللہ مراد لیا جاتا ہے اور 'داس' کے معنی پجاری کے ہیں۔ گویا الکھ داس کے معنی عبد اللہ کے ہیں۔ یوں شیخ عبد القدوس گنگوہی نے 'الکھ داس' کے پردے میں رہ کر اپنے ہندی دوہوں میں معرفت کے گیت گائے اور ہندوؤں کے 'کثرت پسند' معاشرے کو وحدت کی شراب پلاتے رہے۔

"شمس العشاق شاہ میراں جی بیجاپوری دکن کے نامور صوفی اور شاعر جو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور اپنے ایک خواب کی تعبیر دیکھنے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے مدینہ منورہ سے ہوتے ہوئے دکن پہنچے۔ یہاں بیجاپور کو جاے قیام اور دکنی زبان کو ذریعہ اظہار بنا کر حضرت شاہ صاحب نے متعدد رسائل تصنیف کیے اور شاعری میں وحدت کے نغمے الاپے۔" (۱۲)

مذکورہ بالا صوفیائے کرام کے علاوہ

"حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری، حضرت شیخ بہاؤالدین باجن، حضرت شاہ برہان الدین جانم اور حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی جیسے جلیل القدر صوفیائے عظام اور علمائے حق کی محنتوں اور ریاضتوں کا فیض تھا جس نے ہندوستان جیسے جہالت میں ڈوبے ہوئے معاشرے کو ظلمتوں سے نکالا اور عربی و فارسی آمیز بھاشاوں کو ذریعہ بنا کر برصغیر کے چپے چپے میں علم و عرفان کی شمعیں روشن کیں۔ مولانا حافظ محمود شیرانی کے مطابق جب پایہء تخت لاہور سے

دہلی اور آگرہ منتقل ہوا تو مسلمانوں نے تین زبانوں کو تین الگ الگ دائروں میں ذریعہء اظہار کے طور پر استعمال کیا۔فارسی ان کی دفتری اور علمی مقاصد (تاریخ نویسی و انشاءپردازی وغیرہ) میں استعمال ہونے والی زبان تھی۔اردو جسے مسلمان پنجاب سے لے کر گئے تھے عام بول چال کے لیے استعمال کی جاتی تھی جب کہ تیسری زبان برج بھاشا تھی جسے وہ شعر اور موسیقی کی زبان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔"(۱۳)

مسلمان، برصغیر میں جہاں بھی گئے اور حکم ران، تاجر، صوفی، دست کار یا جس حیثیت سے بھی گئے، شعر و ادب سے خاص لگاؤ کی بنا پر اس علاقے کی بھاشا کو ذریعہ اظہار بناتے رہے۔اس طرح مسلمان حکم رانوں تاجروں عالموں صوفیوں سیاحوں اور دست کاروں کے ذریعے سے مختلف زبانیں اور بھاشائیں برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرتی رہیں۔یوں مسلمانوں کی جہاں گردی کے نتیجے میں ایک نئی زبان کے خدوخال ابھرنے لگے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اردو زبان عربی، فارسی، ترکی اور مقامی بھاشاؤں سے مل کر بنی ہے ان زبانوں کی آمیزش تبھی ممکن تھی جب ان زبانوں کے بولنے والوں کا آپس میں اختلاط اور میل جول ممکن ہوتا۔اس آزادانہ میل جول کی ایک صورت مختلف قوموں کے درمیان تاجرانہ تعلقات ہیں۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنی کتاب "اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب" میں ڈاکٹر تاراچند کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"ہندوستان اور خلیج فارس کے درمیان تجارتی تعلقات زمانہ قدیم سے رہے ہیں ان تعلقات کے سبب مال و اسباب کے ساتھ خیالات کا لین بھی ہوتا رہا۔"(۱۴)

مال و اسباب کے ساتھ خیالات کا لین دین ایک فطری امر ہے زبانوں کے فروغ کا یہ معاشی عامل بھی دوسرے دو محرکات کی طرح ایک اہم اور قوی محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔دِساوَر سے آنے والی ہر ایک چیز اپنے ساتھ کئی الفاظ لے کر آتی ہے۔ہر لفظ ایک نئے خیال اور نئے پیرایہء بیان کا محرک بنتا ہے یوں تبادلہء اشیا بالواسطہ طور پر تبادلہء خیال کا سبب بنتا ہے۔جیسے سکرٹ اور بلاؤز یا شلوار اور قمیض صرف دو کپڑوں کے نام نہیں بل کہ دو تہذیبوں کو Signify کرتے ہیں. اسی طرح اسکول اور مدرسہ دو لفظ نہیں بل کہ دو مختلف نظام ہائے تعلیم کی علامتیں ہیں۔غرض اشیا کا لین دین کرتے کرتے ترقی یافتہ قوم کی زبان پس ماندہ قوم کی زبان پر غالب آجاتی ہے۔یہاں بھی پانی کا نشیب کی

طرف جانے کا قانون اپنی صداقت منواتا ہے اور پس ماندہ قوم، ترقی یافتہ قوم کے بار تلے دبتی چلی جاتی ہے۔ اگر دونوں قوموں کے درمیان برابری کا تعلق ہو تو دونوں قومیں اپنا توازن برقرار رکھتی ہیں اور دونوں فایدے میں رہتی ہیں جیسا کہ ایران اور ہند کے تجارتی تعلقات میں نظر آتا ہے۔ اگر ہندوستان کی بنی ہوئی فولادی اشیا ایران میں مشہور تھیں۔"(۱۵)

> "تو ایرانی قالین ہندوستان کے رؤسا اور امرا کی بنیادی ضرورت تھے۔ اگر ایران میں ہندی تلوار "ہندوی اژدہا" کے نام سے مشہور تھی۔"(۱۶)

تو ہندوستان میں ایرانی پارچہ جات اور خوشبوؤں کی بہت زیادہ مانگ تھی۔

الفاظ کے تبادلے کی چند مثالیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اس بیان سے سامنے آتی ہیں:

> "رقم کی ترسیل کے لیے استعمال ہونے والے پرچہ راہداری کو "ہندیاں" کہتے تھے جو ہندوستانی زبان میں "ہنڈی" بن گیا۔ اہل ہند اور اہل فارس کے درمیان تجارتی تعلقات کی وسعت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بلخ میں ہند کے تاجروں اور عالموں کے رہنے کے لیے ایک قلعہ موجود تھا جس کا نام "ہندوان" تھا چناں چہ "ہندوی" یا "ہندی" جو کہ ہندوستان کی زبان کے نام ہیں، اصلاً فارسی ہیں۔"(۱۷)

دو قوموں کے درمیان پرامن تعلقات کا آغاز اکثر تجارت ہی سے ہوتا ہے۔ ہندوستان اور عرب و فارس کے درمیان تجارتی تعلقات اس حد تک بڑھ گئے کہ تجارتی سے زیادہ تہذیبی و ثقافتی ہو گئے اور دونوں قوموں میں علمی و ادبی اور تہذیبی و ثقافتی لین دین کا عمل شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنی کتاب "اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب" میں ڈاکٹر تاراچند کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "بقول ڈاکٹر تاراچند ہندوؤں سے تجارتی اور دوسرے تعلقات کی بنا پر مسلمان اس بات کے خواہش مند تھے کہ وہ ہندوؤں کے رسم و رواج، دستور اور مذاہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔ سلیمان اور مسعودی نے اپنے سفر کے دوران میں اطلاعات جمع کر کے انھیں اپنی تحریرات میں استعمال کیا۔ یہی نہیں اشعری، البیرونی، شہرستانی اور کئی

دوسروں نے بھی اپنی تصانیف میں ہندو مذہب اور ہندو فلسفے کی بحث پر پورے ابواب صرف کیے۔"(۱۸)

برصغیر میں مسلمان فاتحین کی آمد کے بعد تجارتی قافلے توبہ دستور ایک سے دوسرے ملک آتے جاتے رہے لیکن معاشرت کی تبدیلی کے ساتھ زبان کی تبدیلی کا عمل بھی تیز ہو گیا۔ کبھی لشکروں کے پڑاو اور کبھی ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف کوچ کے دوران میں عربی، فارسی، ترکی اور پشتو بولنے والے سیاحوں کا مقامی آبادی کے ساتھ تعامل (Interaction) بڑھتے بڑھتے "من تو شدم تو من شدی" کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ فاتحین مقامی بھاشاؤں میں گفت گو کرنے لگے اور مقامی باشندے عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ بے تکلف استعمال کرنے لگے۔ ان حالات میں ایک نئی زبان کا وجود میں آنا برصغیر کا مقدر ہو گیا اور اِس معاشی عامل نے سیاسی اور مذہبی عامل کے ساتھ مل کر نہ صرف اردو کی بنیاد رکھی بل کہ اسے یہ امتیاز بخشا کہ سیکڑوں اور ہزاروں سال سے زیرِ استعمال زبانوں کی موجودگی میں اردو نے برصغیر کے طول و عرض میں لنگوا فرانکا کا درجہ حاصل کر لیا۔

حوالہ جات

1۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، اردو غزل اور ہندستانی ذہن و تہذیب، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۲ء، ص:۲۰

2۔ سلیمان ندوی، سید، نقوش سلیمانی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۸۰ء، ص:۳۱

3۔ شیرانی، محمود خان، حافظ، پنجاب میں اردو، لکھنؤ: مکتبہ ءکلیاں، ۱۹۶۰ء، ص: ۷۰

4۔ گیان چند جین، اردو کے آغاز کے نظریے، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ، مرتب: مرزا خلیل احمد بیگ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۱۱ء، ص: ۴۴

5۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۰۲

6۔ ایضاً، ص:۱۰۳

7۔ ایضاً، ص:۱۰۴

8۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، س۔ن، ص:۱۴

9۔ ایضاً، ص:۱۳

10۔ ایضاً، ص:۲۰

11۔ ایضاً، ص:۲۸

12۔ ایضاً، ص:۴۰

13۔ شیرانی، محمود خان، حافظ، پنجاب میں اردو، لاہور: انجمن ترقی اردو اسلامیہ کالج لاہور، س۔ن، ص: ۱۰۶

14۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۲ء، ص: ۷۳

15۔ ایضاً، ص:۷۳

16۔ ایضاً، ص: ۷۳

17۔ ایضاً، ص: ۷۳

18۔ ایضاً، ص: ۷۴

References:

1- Narang, Gopichand, Doctor, Urdu Ghazal and Indian Mind and Culture, New Delhi: National Council for Promotion of Urdu, 2002, p. 20

2- Suleiman Nadwi, Sayyid, Naqosh Sulaimani, Azamgarh: Dar-ul-Lekhin, 1980, p.31

3- Shirani, Mahmood Khan, Hafiz, Urdu in Punjab, Lucknow: Maktaba Kalian, 1960, p. 70

4- Gian Chand Jain, Theories of the Origins of Urdu, Content: History of the Urdu

Language, compiled by Mirza Khalil Ahmad Baig, Aligarh: Educational Book House, 2011, p. 44

5۔ Narang, Gopichand, Doctor, Urdu Ghazal and Indian Mind and Culture, New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 2002, p. 102

6۔ Ibid. p. 103

7۔ Ibid. p. 104

8۔ Abdul Haq, Maulvi, Doctor, Work of Sufis in the Early Development of Urdu, Aligarh: Anjuman-e-Pragati Urdu Hind, S. N, p. 14

9۔ Ibid. p.13

10۔ Ibid. p.20

11۔ Ibid. p.28

12۔ Ibid. p.40

13۔ Shirani, Mahmood Khan, Hafiz, Urdu in Punjab, Lahore: Anjuman-e-Pragati Urdu Islamia College, Lahore. N, p. 106

14۔ Narang, Gopichand, Doctor, Urdu Ghazal and Indian Mind and Culture, New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 2002. P.73

15۔ Ibid. p. 73

16۔ Ibid. p. 73

17۔ Ibid. p. 73

18۔ Ibid. p. 74